سرسیّد احمد خان مصری جامعات میں۔ایک تجزیہ

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم السیّد
Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim Al-Syed

Abstract:

"On the scholarly and cultural work of sir syed was not only discussed in sub continent but also in whole world in this regard in the universities of the Egypt many books research papers and conferences were held on different aspects of sir syed's thoughts in this article effort is done to analysis the work done in Egyptian universities."

۱/۶: سرسیّد احمد خان کون تھے

سرسیّد خان اُنیسویں صدی میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔آج بھی انھیں پاکستان اور ہندوستان میں ایک عظیم شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔مسلمانوں میں بیداریٔ علم کی تحریک پیدا کرنے میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں جس جذبہ سے انھوں نے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس کو عام طور پر سراہا گیا۔گو ان شعبوں میں بھی ہر ایک کو ان کے نظریات سے، خصوصاً مذہبی امور میں، کلی اِتفاق نہ تھا۔اس کے باوجود کوئی یہ اِنکار نہیں کرسکتا کہ سرسیّد احمد خان برصغیر پاک و ہند میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے بڑے علمبردار رہے۔جب سرسیّد نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا، اس وقت مسلمان انتشار کا شکار تھے۔کوئی لائحۂ عمل نہ تھا۔نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح تالاب میں ٹھہرا پانی آئے دن زیادہ بدبودار ہوتا جاتا ہے۔اسی طرح مسلمان بھی بگڑتے جارہے تھے۔سرسیّد کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔[۱]

سرسیّد احمد خان ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ، مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دِلّی میں پیدا ہوئے۔۱۷ یا ۱۸ برس کی عمر میں سرسیّد کی شادی ہوئی۔ان کا پہلا بیٹا سیّد حامد ۱۸۴۹ء میں اور دوسرا بیٹا سیّد محمود ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔۲۲ برس کی عمر میں والد فوت ہوئے۔لہٰذا انھیں ملازمت کرنا پڑی۔ملازمت میں دُور دراز کے اِضلاع میں تبادلے ہوتے رہے۔ان کی والدہ عزیز النساء بیگم ۱۸۵۷ء میں فوت ہوئیں۔اور ان کی اہلیہ کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہوا۔

صدرِ شعبۂ اُردو، فیکلٹی آف ہیومنٹیز، الازہر یونیورسٹی۔قاہرہ، مصر

سرسیّد کی تعلیم پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی تھی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں، خالق باری اور گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں۔ اس کے بعد عربی کی شرح ملا اور شرح تہذین جیسی کتابیں پڑھیں۔ (۲)

سرسیّد ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے متوسط درجے کی دینی تعلیم پائی تھی اور دینی علوم اور کتاب وسنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی۔ جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے۔ (۳)

سرسیّد کی ملازمت کا آغاز ۱۸۳۸ء سے ہوا جب وہ دہلی میں سرشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں نائب منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دِلّی کے صدر امین رہے۔ ۱۸۵۵ء میں سرسیّد بجنور منتقل ہو گئے۔ بجنور ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع ہوئی۔ انگریزوں کی ملازمتوں کے سلسلے میں سرسیّد کا تبادلہ ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کی حیثیت سے مرادآباد، ۱۸۶۲ء میں غازی پور ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ اور ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں ۳۷ سال کی ملازمت کے بعد سرسیّد احمد خان چھ سو روپے ماہانہ وظیفہ پر ریٹائر ہو گئے اور ۱۸۹۸ء میں ۸۱ سال کی عمر میں انھوں نے وفات پائی۔

تصانیف

تصنیف و تالیف کے میدان میں سرسید احمد خان نے پچاس کتابوں کے قریب لکھیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ جامِ جم: فارسی زبان میں تیموری سلاطین (امیر تیمور صاحب قرن سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ ظفر تک سے متعلق: ۱۸۳۹ء

۲۔ انتخاب الاخوین: اس میں سرسید نے قواعد منصفی بیان کیے۔

۳۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب: ایک میلاد شریف، آنحضرت ﷺ کی سیرت پر مختصر رسالہ: ۱۸۴۳ء

۴۔ تحفۂ حسن: شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے باب دہم و دوقاز دہم کا اردو ترجمہ: ۱۸۴۴ء

۵۔ التسہیل فی جرالثقیل: عربی کے ایک رسالہ کے فارسی ترجے (معیار العقول) کا اردو ترجمہ: ۱۸۴۴ء

۶۔ آثار الصنادید: دہلی کے تقریباً دو سو عمارات اور ایک سو بیس مشاہیر کے احوال پر مشتمل: ۱۸۴۷ء

۷۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار: سرسید کے نانا کے بعض فارسی تحریرات کا ترجمہ

۸۔ قول متین در ابطال حرکت زمین: زمین کی گردش کی تردید اور آسماں کی گردش کی حمایت پر ایک رسالہ

۹۔ کلمۃ الحق: پیری مریدی کے مروجہ طریقے پر تنقید: ۱۸۴۹ء

۱۰۔ راہِ سنت ور دِ بدعت: اہلِ تقلید کے مروجہ عقائد و رسوم پر تنقید: ۱۸۵۰ء
۱۱۔ نمیقہ: در بیان مسئلہ، تصور شیخ: ۱۸۵۲ء
۱۲۔ سلسلۃ الملوک: آثار الصنادید کا ایک حصہ جو بعد میں الگ شائع کیا گیا: ۱۸۵۲ء
۱۳۔ کیمیائے سعادت: امام غزالی کے چند اوراق کا اردو ترجمہ: ۱۸۵۳ء
۱۴۔ تاریخ ضلع بجنور: ضلع بجنور کی تاریخ، جنگ آزادی میں ضائع ہوگئی: ۱۸۵۵ء
۱۵۔ آئین اکبری کی تصحیح اور حواشی: تین جلدوں پر مشتمل کتاب، جنگ آزادی میں دوسری جلد ضائع ہو گئی، اب اس کی پہلی اور تیسری جلد موجود ہے۔
۱۶۔ تاریخِ سرکشیٔ بجنور: ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک کے جنگ آزادی کے واقعات۔
۱۷۔ اسباب بغاوت ہند: ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش: ۱۸۵۸ء
۱۸۔ تحقیق لفظ نصاری: قرآن وحدیث اور لغت کی روشنی میں لفظ نصاری کی تشریح۔
۱۹۔ تاریخ فیروز شاہی کی تحقیق: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر ضیاء برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح اور حواشی: ۱۹۶۲ء
۲۰۔ تبیین الکلام: انجیل اور قرآن مجید کی اصولی وحدت ثابت کرنے کی کوشش۔
۲۱۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب: اسلامی شعائر کا عملی نقطہ نظر سے جائزہ اور ان پر عقلی استدلال: ۱۸۶۸ء
۲۲۔ مسافرانِ لندن: سرسید کے سفر انگلستان (اپریل ۱۸۸۹ء سے اکتوبر ۱۸۷۰ء تک) کے مشاہدات وتاثرات پر مشتمل
۲۳۔ خطبات احمد یہ سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے اعتراضات کا تیرہ خطبات پر مشتمل جواب۔
۲۴۔ تفسیر القرآن (غیر مکمل): سرسید کی آخری تصنیف، اس کا محور دین میں صرف قرآن مجید یقینی ہے۔ باقی سب (حدیث، اجماع اور قیاس) اصولِ دین میں شامل نہیں۔

اخبار ورسائل

۱۔ رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا: ۱۸۶۰ء میں جاری ہو کر ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔
۲۔ سائنٹفک سوسائٹی اخبار: ۱۸۶۶ء میں سرسیّد نے یہ اخبار علی گڑھ سے نکالا۔ بعد میں اس کا نام علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ رکھا۔
۳۔ تہذیب الاخلاق: ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہونا شروع ہوا اور تین دفعہ نئی زندگی پائی۔ (۴)

سرسیّد کی تعلیمی وادبی خدمات

سرسید احمد خان کے کاموں کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کام جو بحیثیت مصنف انہوں نے تاریخ، مذہب، معاشرت اور ادب کے موضوعات پر تصنیف و تالیف کے ذریعے انجام دیئے۔ دوسرے وہ کام جو بحیثیت مصلح انہوں نے مذہبی اور معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لیے کیے اور تیسرے وہ کام جو انہوں نے سیاسی اور قومی سطح پر مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے انجام دیئے۔

سرسید احمد خان نے تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو ہندوستان کی دوسری قوموں کی سطح پر پہنچا دیں۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کر کے انہیں ایک نیا حوصلہ دیا۔ اسی کے طفیل مسلمانوں نے سیاست میں جدید رجحانات کو قبول کیا اور ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اپنی حیثیت اور قومیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سرسید نے زیادہ زور جدید تعلیم پر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہے اور یہ کہ مسلمانوں کی موجودہ بدحالی کا بڑا سبب مسلمانوں کا انگریزی علوم سے بے بہرہ ہونا ہے۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کو انگریزی زبان اور تہذیب سے نفرت کا رویہ ترک کر کے مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ جدید اور اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''بس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور ہم اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں، اعلیٰ درجے کی تعلیم میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں۔ بس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیے۔۔۔ سب باتوں کا حاصل ہونا تعلیم پر موقوف ہے۔ جب تم پوری تعلیم پاؤ گے اور سچے تعلیم تمہارے دلوں میں بیٹھے گی تو خود تمہارے دل میں ان حقوق کا خیال پیدا ہوگا جو تم واجبی طور پر برٹش گورنمنٹ سے پا سکتے ہیں۔''(۵)

چنانچہ ۱۸۶۱ء میں جب سرسید مراد آباد میں تھے تو انہوں نے ایک انگریزی سکول قائم کیا۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے قیام کے دوران وہاں بھی جدید طرز کا ایک سکول کھولا۔ ۱۸۶۲ء میں انہوں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ نئے علوم کی کتابیں اردو زبان میں شائع کی جائیں اور اس طرح مسلمان مغرب کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں۔

۱۸۶۴ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور سوسائٹی سے ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی کا ایک اخبار ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے نکالا جس میں سرسید خود بھی مختلف مضامین لکھتے تھے اور انگریزی اخباروں سے بھی اچھے اچھے مضامین کے ترجمے شائع کراتے تھے۔ اسی سال سرسید نے ''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' قائم کی۔

۱۸۷۰ء میں لندن سے واپسی کے بعد سرسید نے اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب اخلاق'' جاری

کیا۔ ''تہذیب اخلاق'' نے اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ تہذیبی، سماجی، مذہبی اور تعلیمی موضوعات پر اس کے مضامین جو نئی فکر اور بالکل نئے اسلوبِ بیان سے بہرور تھے جدید اردو ادب کا سنگِ بنیاد بن گئے۔(۶) ''تہذیب اخلاق'' کے ذریعے اور ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے حوالے سے سرسید احمد خان نے اپنے رفقا کی ایک پوری جماعت تیار کر لی تھی۔ اس جماعرت میں نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد اور دیگر کئی اکابرین شامل تھے۔ ''تہذیب اخلاق'' کی اہمیت کا اندازہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید نے جس سماجی، سیاسی اور تعلیمی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا ''تہذیب اخلاق'' اسی کا داعی تھا۔ سرسید کی تمام نزاعی تحریریں اس میں شائع ہوتی تھیں۔

سرسید کا مقصد تھا کہ نوعمر مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے تا کہ یہ نوجوان سرکاری نوکریوں اور قوم کی خدمت میں اپنے جائے مقصود حاصل کر سکیں۔ اس منصوبے اور ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے انہوں نے سن ۱۸۷۵ء میں ''علی گڑھ کالج'' کی بنیاد ڈالی۔ یہ دانش گاہ اپنے وقت میں اسلامی جدیدیت کا واحد مرکز بنا اور اس منبع سے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اور سرکاری ملازموں اور اہلِ فکر کی نکلی جنہوں نے اسلام پر مغربی ممالک کے اعتراضات کی عذر خواہی کی اور مغربی تنقید کے وار سہنے کے انتظام درست کیے۔ یہ کالج بظاہر ایک تعلیمی ادارہ تھا۔ مگر اسے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے ایک اہم سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ سرسید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے ''علی گڑھ کالج'' کو یونیورسٹی کے درجے تک پہنچانے کے لیے کوشش شروع کی اور ان کی زندگی میں سات آٹھ لاکھ جمع ہوا۔ ان کے بعد ہز ہائینس آغا خان نے اس کام کے لیے بڑی محنت کی۔ بیس لاکھ روپے کے فنڈ کے بغیر حکومت یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ہز ہائینس نے دورہ کر کے یہ رقم جمع کر دی۔ لیکن حکومت نے چند اسی شرطیں عائد کیں کہ نواب وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا شبلی نعمانی نے ان کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا معاملہ عرصے تک کھٹائی میں پڑا رہا۔۔۔ اور بالآخر بہت سی قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد کارکنان علی گڑھ کالج نے انہیں شرائط پر یونیورسٹی بنانی قبول کر لی۔ جو پہلے نامنظور کی تھیں اور جنوری ۱۹۲۱ء بمطابق ۱۳۴۰ھ سے پرانا علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا۔

۶/۲: سرسیّد احمد خان اور مصر

سرسید احمد خان نے ۱۸۶۹ء میں لندن جاتے ہوئے مصر کا سفر کیا۔ تھوڑے عرصے کے لیے مصر میں رہے پھر لندن چلے گئے۔ سرسید انگلینڈ میں تقریباً ڈیرھ سال کے لگ بھگ رہے۔ پھر جب انڈیا واپس چلے گئے تو انہوں نے ایک مجلہ ''تہذیب اخلاق'' کے نام سے نکالا۔ اسی مجلّے میں مصر کے بارے میں چار مقالے لکھے۔ تین مقالے مصری معاشرے اور مصریوں کی ثقافت اور تعلیم کے حوالے سے تھے جب کہ چوتھا مقالہ اس زمانے میں شاہِ مصر کے بارے میں تھا۔ کہتے ہیں:

''مشہور ہے کہ مسلمانی ریاستوں میں سے مصر نے تہذیب وشائستگی میں بہت ترقی کی ہے۔
اس لیے ہم اُس کا کچھ حال جو ہماری آنکھ کا دیکھا ہے لکھتے ہیں۔''(۷)

سرسید نے اپنے مقالات میں مصر میں رہنے والے لوگوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا۔ پھر انہوں نے ان چار طبقوں کے طرزِ زندگی کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کی۔ پہلے طبقے، یعنی مصر میں رہنے والے یورپین کے متعلق کہتے ہیں:

''یورپ کی قومیں جو مصر میں ہیں اگرچہ وہ بہ نسبت اُن یورپین قوموں کے جو خاص یورپ میں رہتی ہیں۔ تہذیب وشائستگی میں کم ہیں، لیکن پھر بھی نہایت مہذب اور شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں۔''(۸)

دوسرے طبقے یعنی مسلم مصری امیروں اور اونچے عہدے والے ملازموں کے بارے میں کہتے ہیں:

''مسلمان امراء ورؤساء وعہدہ داران نے بالکل اپنا قدیم طریقہ اور قدیم لباس اور پرانا طرزِ زندگی چھوڑ دیا ہے۔ سب کے سب کوٹ پتلون پہنتے ہیں اور لال پھندنے دار ترکی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ میز وکرسی پر بیٹھتے ہیں۔ چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں۔ اکثر فرنچ اور عربی اور ترکی تینوں زبانیں جانتے ہیں۔ اُن کی نسبت مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر بالکل یورپین کی مانند مہذب نہیں ہو گئے ہیں تو ان کی پوری پوری نقل تو ضرور کی ہے۔''(۹)

تیسرے طبقے، مصری عیسائی کے بارے میں کہتے ہیں:

''عیسائی مصری بھی تہذیب وشائستگی میں کم نہیں۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب یورپین بھائیوں کا سا برتاؤ اور طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں دو ایک عیسائی مصری سے ملا اور اُن کو تہذیب و شائستگی میں آراستہ پایا۔ وہ سب قبطی نسل کے تھے اور اُن میں سے ایک شخص باوجود کہ بجز عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ مگر ہر بات اور عادات اور بات چیت میں مثل یورپین جنٹلمین کے مہذب تھا۔''(۱۰)

چوتھے طبقے، یعنی متوسط اور ادنیٰ طبقے کے بارے میں کہتے ہیں:

''متوسط درجہ اور ادنیٰ درجہ کے مسلمان مصری جو بہت کثرت سے ہیں، نہایت خراب اور ابتر حالت میں ہیں۔ میلے اور نہایت میلے اور لباس خراب اکثر نیلا کُرتا، جس کا گریبان کھلا ہوا ہے پہنے ہوئے ہیں اور ٹانگوں میں کوئی چیز نہیں۔ بالکل ننگی اور کپڑا ایسا میلا کہ شاید پہنے کے مابعد کبھی دھونے کی نوبت نہیں آتی ہوگی۔ پاس بٹھانے کو دل نہیں چاہتا۔ بدن و کپڑوں میں سے بری بو آتی ہے۔ متوسط درجہ کی عورتوں کی حالت بہ نسبت مردوں کے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ادنیٰ درجہ کی عورت و مرد کی نہایت خراب حالت معلوم ہوتی ہے اور جو کہ یہی لوگ سب سے زیادہ کثرت سے ہیں، اس لیے مصر باعتبار خلقت کے آنکھ میں نہایت برا

اور خراب معلوم ہوتا ہے۔ مصر میں جاؤ اور عام طور پر وہاں کی خلقت پر نظر ڈالو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ہندوستان میں قحط کے دنوں میں بھٹئیر کی طرف کے لوگ عورت و مرد نیلے کرتے پہنے ہوئے اور تباہ حالت میں چلے آتے ہیں۔ تمام یورپین کیا مرد اور کیا عورت اُن لوگوں میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے اندھیری رات میں تارے یا کوڑے میں موتی۔''(۱۱)

عام مصری لوگوں کے گفتگو کرنے کے طریقے کے بارے میں کہتے ہیں:

''اس درجہ کے لوگوں کا لہجہ گفتگو ایسا ناشائستہ اور خراب ہے کہ ان کی نامہذب آواز کی دل پر چوٹ لگتی ہے۔ بہت بلند اور حلق میں نکلنے والی اور نہایت درشت آواز سے جس میں گردن کی رگیں تن جاتی ہیں باتیں کرتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو جانور آپس میں لڑ رہے ہیں پہلے پہل جب میں نے مصریوں کو آپس میں بات چیت کرتے دیکھا تو میں نے خیال کیا کہ بہ سبب عربی زبان ہونے کے جس میں حروف حلقی زیادہ ہیں، ان کا لہجہ ایسا خراب ہے۔ مگر میں نے جب قبطی عیسائیوں کو دیکھا جو تربیت یافتہ تھے۔ ان کا لہجہ سب اور آواز نرم اور آہستہ آہستہ بات کرنا سب کچھ عمدہ تھا۔ ان کے منہ سے لفظ پیارے معلوم ہوتے تھے اور عورتوں کے منہ سے تو عربی لفظ نہیں نکلتے تھے، بلکہ پھول جھڑتے تھے۔''(۱۲)

اس کے باوجود سر سید احمد خان نے کہیں کہیں مصریوں کی تعریف بھی کی۔ کہتے ہیں:

''ہر قسم کا ہنر مصریوں میں ترقی پر ہے۔ تمام کام ریل کے چلانے کا مصری خود آپ کرتے ہیں۔ دھوئیں کی کل سے کام لیتے ہیں۔ دھوئیں کا پمپ اور دھوئیں کا ہل گنوار دہقانوں کو چلاتے میں نے دیکھا۔ کاغذ بنانے کی کل جو دھوئیں سے چلتی ہے مصری چلاتے ہیں اور کاغذ بناتے ہیں۔ دھوئیں کی کل سے مصری چھاپے خانے کا کام کرتے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے سبب ہم مصریوں کو ہندوستان کے مسلمانوں سے باوجود یہ کہ ہندوستان کے مسلمان ان سے بہت زیادہ خوش حال ہیں ہم فوقیت دیتے ہیں۔''(۱۳)

مصر کے قومی عجائب گھر کے بارے میں کہتے ہیں:

''میوزیم مصر کا یعنی عجائب خانہ ایسا عمدہ ہے کہ مصر کی پرانی چیزوں کے لیے اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ پرانی لاشیں جو ممی کلاتی ہیں اور پرانی صنائع مصر کی نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے آراستہ ہیں اور بہت فائدہ بخش عبرت انگیز اور حیرت خیز ہیں۔''(۱۴)

۶/۳: سر سیّد مصریوں کی نظر میں

مصر میں سر سید کا تعارف غالباً سید جمال الدین افغانی کے عربی میں اجرا کردہ مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مقالات سے شروع ہوا۔ یہ مجلہ پیرس میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلنا شروع ہوا۔ اس کا آخری شمارہ ۱۷

اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ سید جمال الدین افغانی کو سرسید احمد خان نے مذہبی افکار و خیالات اور سیاسی و رجحانات سے پورے طور اختلاف تھا۔ لہٰذا انہوں نے مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' میں سرسید پر سخت تنقید کی۔ مصر کے مذہبی حلقوں نے سرسید کے بارے میں اس مجلّے کے ذریعے ایک رائے قائم کی۔ اس کا نچوڑ یہ ہے کہ دینی حوالے سے سرسید کے خیالات گمراہ کن تھے۔

مصر میں سرسید احمد خان سے تعارف کا دوسرا مصدر مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے عربی تصانیف تھا۔ چونکہ مولانا سید سلیمان ندوی جید عالم تھے۔ عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ ان کی کئی تصانیف عربی میں تھیں۔ عالم عرب میں بالعموم اور مصر میں بالخصوص ان کو اور ان کی تصانیف کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لہٰذا ان کا عالمِ عرب پر مصریوں سمیت گہرا اثر رہا اور یہیں سے بھی مصریوں کا سرسید سے تعارف شروع ہوا اور چونکہ سید سلیمان ندوی کو سرسید کے مذہنی نقطۂ نظر اور دینی رجحانات سے اختلاف تھا اور انہوں نے اپنی کتابوں میں سرسید کے اس پہلو پر تنقید کی۔ لہٰذا سرسید کے حوالے سے جو تصور مصریوں (اور خاص کر دینی حلقوں) کے ذہن میں اُبھرا، وہ شروع میں یہیں سے آیا یعنی کہ سرسید عقل پسندی سے اتنے متاثر تھے کہ شریعت کے اصول اور احکامات کا منطقی طور پر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تفسیر کے اصولوں کو نئے سرے سے بنایا۔ قرآن پاک کو نئے معانی پہنانے کی کوشش کی۔ حدیث اور معجزوں سے انکار کیا۔ مستند علماء اور مفسرین پر چوٹ کیا۔ قرآن پاک، حدیث شریف، فقہ اور فلسفے کے ہر مسئلے میں نیچر کی تاویل یا تعبیر ضرور کرتے تھے۔

ایک اور بات تھی جو شاید مصریوں کے ذہن میں سرسید احمد خان کے بارے میں قائم شدہ تصور کو بالواسطہ طور پر تقویت دی وہ سرسید کی مصر پر انگریزوں کے قبضے کی حمایت تھی۔ انگریزوں سے اپنی انتہا وفاداری والی پالیسی کے تحت سرسید احمد خان اور سید امیر علی نے انگریزوں کے اس موقف کی حمایت کی کہ مصر بحران کی حالت سے دو چار ہے۔ احمد عرابی (جو مصریوں کا قومی ہیرو ہیں) کو مرعوب کرنے کی خاطر انگریزوں نے اپنی فوج مصر بھیجی۔ اس فیصلے کی بھی انہوں نے تائید کی۔ سید امیر علی نے ہندوستان سے ''لندن ٹائمز'' کو ایک خاط لکھا جس میں احمد عرابی کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان مصر پر انگریزوں کے قبضے کی پوری حمایت کرتے ہیں۔ (۱۵)

سرسید سے مصریوں کا مزید تعاریف بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوا جب مصری دانشور اور ادیب احمد امین نے اپنے معرکۃ الآرا کتاب ''**زعما الاصلاح فی العصر الحدیث**: جدید دور میں اصلاح کے سرخیل''، لکھی، جس میں انہوں نے سرسید کے بارے میں ایک مستقل فصل لکھی۔ احمد امین کو سرسید کی شخصیت اور کارنامے پسند تھے۔ وہ ان کی عقلیت پسندی سے کافی متاثر تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب میں ان کی تعریف کی۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ان علماء کے حوالے سے لکھا کہ وہ صرف دین کا ظاہر جانتے ہیں اور دین کی اصل حقیقت نہیں جانتے۔ ایسے علماء چاہتے ہیں کہ جدید تہذیب و

مدنیت کو اپنی محدود عقل کے تابع بنائیں اور تہذیب و مدنیت کو کافر سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''سرسید نے دیکھا کہ ہندوستان میں تقریباً سات کروڑ مسلمان ہیں، جن میں غربت، جہالت، مایوسی اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ ان میں سے جس کسی نے تعلیم حاصل کی تو بے فائدہ دینی تعلیم حاصل کی جو لوگوں میں نہ تو وسعتِ نظر اور نہ ہی زندگی کی حرارت پیدا کرسکتی۔ یہ مسلمان ایسے علمائے دین کی پیروی کرتے ہیں جو خود دین کے بارے میں سطحی علم رکھتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ جدید وسیع مدنیت کو اپنی محدود عقل کے تابع کرلیں۔ وہ نہ زمانے کی تبدیلی کا اعتراف کرتے ہیں نہ زندگی کی رنگینی کا اور نہ ہی علمی ترقی کا۔ وہ خود جامد زندگی گزار رہے ہیں جب کہ ان کے اردگرد باقی دنیا بہت متحرک ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کل کی جدید تہذیب، اس کا علم، اس کا نظام اور اس کے وسائل و مقاصد سمیت سب کفر ہے۔ جس سے مسلمان کو مدد نہیں لینا چاہیے اور نہ ہی اس کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ یہ علماء سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے جدید مدنیت کے لیے اپنا دل کھول دیا تو ان کے عقیدے برباد ہو جائیں گے اور وہ خارج از دین ہو جائیں گے۔''(۱۶)

احمد امین نے اپنی اس کتاب میں سرسید کو محمد عبدہ سے تشبیہ دی۔ دونوں کو اپنے اپنے ملک میں مصلح قرار دیتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک معاشرے کی اصلاح تعلیم سے شروع ہوتی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے برسرِ اقتدار قابض حکومت سے مدد لینے، اس کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کے ساتھ ٹکر نہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہتے ہیں:

''ہندوستان میں سرسید ایسے ہیں جیسے مصر میں شیخ محمد عبدہ ہیں۔ دونوں کے نزدیک لوگوں کی اصلاح تعلیم و تہذیب پھیلانے اور دین کے معاملے میں رواداری اور غیر متعصب رویہ اپنانے میں ہے۔ پھر آزادی خود بخود آتی ہے۔ جاہل اور کم عقل کے لیے کوئی آزادی نہیں ہوتی۔ آزادی کی بنیاد علم ہے، دین اور دنیا کا علم۔ جدیدیت کے تمام علوم جیسے فزکس، کیمسٹری، ریاضی، فلکیات، سائیکلوجی، سشیولوجی وغیرہ کے ساتھ ساتھ دین کا وہ علم ہونا چاہیے جو دلوں کو زندہ کرتا ہے، عقل کو مقید نہیں کرتا روح کو غذا مہیا کرتا اور سوچنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ اسلام کو اگر صحیح اصولوں کے مطابق سمجھا جائے تو وہ یہ سب مہیا کرتا ہے۔ محمد عبدہ اور سرسید دونوں یہ جانتے ہیں کہ مصر اور ہندوستان دونوں کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انگریزوں کی مادی طاقت جیسے بری اور بحری جنگی ہتھیار اور علمی و سیاسی طاقت کے سامنے نہ مصر ٹھہر سکتا ہے نہ ہندوستان۔''(۱۷)

احمد امین اپنی کتاب میں سرسید کی بہادری اور حق کہنے میں بے باکی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بے حد بہادر تھے۔ اپنی رائے کے اظہار

میں بے حد واضح اور دوٹوک تھے۔ اپنے اوپر ہر قسم کی تنقید کرنے والوں کی تنقید کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف اپنی ہی ضمیر کی آواز سننے پر مصر ہوتے تھے۔ انگریزوں کے غرور تکبر، اہلِ وطن کی پسماندگی، علمائے دین کے جمود اور سیاست دانوں کے غیر صحت مندانہ اخیالات پر تنقید کرتے تھے۔''(۱۸)

چند سال بعد مصر کے معروف دانشور اور عالمِ دین ڈاکٹر محمد البھی سابق رئیس جامعہ از ہر نے ۱۹۵۷ء میں ''**الفکر الاسلامی الحدیث بالاستعمار الغربی**'' جدید اسلامی فکر اور اس کا مغربی سامراج سے رشتہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے عالمِ اسلام کے مصلحین کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کی۔ ڈاکٹر محمد البھی نے اپنی کتاب میں سرسید کے بارے میں سید جمال الدین افغانی کی رائے کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ سید احمد خان کی تحریک علوم طبیعہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے عشق و شیفتگی پر قائم تھی۔ اسی طرح جس طرح زمانۂ حال کے بعض مفکرین سائنس اور اس کے ایجادات و فتوحات سے ضرورت سے زیادہ مرعوب ہیں جن پر موجودہ مغربی تہذیب قائم ہے۔ علوم طبیعہ یا طبیعیات سے اس قدر وابستگی اور عشق، روحانی اور مثالی اقدار کی قیمت کم کر دیتا ہے حالانکہ یہ قدریں وہ ہیں جن پر آسمانی مذاہب کی بنیاد ہے اور جس کی نمائندگی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسلام نے کیا ہے۔ علومِ طبیعہ سے یہ غیر معمولی لگاؤ بعض اوقات ہر اس چیز کے انکار تک پہنچا دیتا ہے جو انسانی حس اور مشاہدہ میں نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس کا رشتہ جمال الدین افغانی نے سرسید احمد خاں کے الحاد اور ان کے مذاہب نیچری سے جوڑا ہے اور باوجود ان کے بار بار یہ کہنے کہ وہ اسلام کا دفاع کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا ہے۔(۱۹)

سرسید احمد خان کے حوالے سے ڈاکٹر محمد البھی نے مجلہ ''العروۃ الوثقی'' سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزوں نے بہت پادریوں اور ہندوستان میں موجود دوسرے دینی فرقوں کے رہنماؤں کو اکسایا کہ ایسے تصنیفات و تالیفات لکھیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کریں تاکہ مسلمان اپنے دین چھوڑیں اور عیسائیت کو اپنائیں مگر وہ ناکام رہے۔ ڈاکٹر البھی نے مجلہ ''العروۃ الوثقی'' سے لمبا اقتباس پیش کیا جس سے ایک عبارت درج ذیل ہے:

''اتفاق یہ ہوا کہ ایک شخص جس کا نام احمد خان بہادر انگریزوں کے اردگرد پھرتا رہتا تھا تاکہ ان سے فائدہ لے سکے۔ اس نے اپنا آپ پیش کیا۔ یہاں تک کے وہ اپنے دین سے نکلنے اور انگریزوں کے دین کو اپنانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کے قریب ہونے کے لیے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ توریت اور انجیل میں کوئی تحریف نہیں کی گئی اور نہ کوئی تبدیلی۔ پھر اس نے اپنے کئے پر غور کیا تو پتہ چلا کہ انگریز کسی طور سے اس سے راضی نہیں ہیں جب تک وہ یہ نہ کہے کہ میں

نصرانی ہوں اور یہ کہ اُسے اس گھٹیا کتاب پر جو اس نے لکھی ہے کوئی بڑا اجر نہیں ملے گا، خاص طور پر اس طرح کی کتاب اس سے پہلے ہزاروں پادریوں سے لکھوائی گئیں۔ مگر اس نے نتیجے میں کسی بھی مسلمان نے اپنا دین نہیں چھوڑا تو سرسید نے اپنے انگریز حکام کی خدمت کے لیے اور راستہ اختیار کیا یعنی مسلمانوں میں تفرقہ ڈالے اور ان میں انتشار پھیلا دے۔ تو وہ دھری اور نیچری کے روپ میں سامنے آیا اور اعلان کیا کہ اندھی نیچر کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کائنات کا کوئی حکیم معبود نہیں اور یہ کہ تمام انبیاء نیچر کے علاوہ کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے تھے چاہے وہ خدا ہی کیوں نہ ہو جسے ہم نے ادیان کے ذریعے پہچانا اور ہم اپنے آپ کو نیچری کا لقب دیا۔۔۔ تب جا کے انگریزی حکام کو سرسید پسند آنے لگا۔ انہوں نے اس میں مسلمانوں کے دلوں میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے بہترین وسیلہ سمجھا۔ چنانچہ اُسے بہت عزت و اکرام سے نوازا۔ علی گڑھ میں ایک سکول بنانے (کھولنے) میں مدد کی اور اس کا نام (محمڈن سکول) رکھا۔ تاکہ یہ مسلمانوں کے بچوں کے لیے ایک جال کی طرح ہو جس میں ان کی تربیت احمد خان بہادر کے افکار و خیالات کے مطابق کی جا سکے۔"[۲۰]

سرسید احمد خان کے بارے (برصغیر پاک و ہند) میں ایک عام تصور ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست، مشرقی تہذیب کے مخالف اور مغربی تہذیب کے حامی، کچھ اسلامی عقائد کے منکر اور کچھ اور کے گمراہ مفسر تھے۔ یہی تصور مصر کے مذہبی اور علمی حلقوں میں سرسید کے بارے میں عام ہوا۔ جب کبھی سرسید کا نام لیا جاتا، یہی کہا جاتا کہ وہ اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مخالف تھے۔ وہ برطانیہ کے ایجنٹ تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ ختم ہو۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کا انگریزوں کی غلامی میں رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ مغربی تہذیب سے انتہائی حد تک مرعوب تھے۔ اس تصور کا انعکاس ہمیں سرسید احمد خان کے متعلق مصر میں لکھی ہوئی کئی کتابوں میں ملتی ہے۔ میری نظر میں اس سخت تصور کی وہ دو بنیادی وجوہات ہیں:

ا۔ سرسید کی وہ روش تھی جو انہوں نے اختیار کیا تھی جس میں دو مسئلے نمایاں طور پر ابھرے۔

پہلا مسئلہ: سرسید نے چند بنیادی اسلامی اصول و عقائد سے تجاویز کیا۔ جس کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ کئی علمائے دین ان سے بدظن ہوئے اور ان پر بہت اعتراضات کئے گئے اور ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی دیئے گئے۔ اسی طرح سرسید نے چند متفرق مذہبی معاملات کو عقلی طور پر آزادنہ طریقے سے بیان کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے ان سے تاویل و تفسیر میں بھول ہوئی۔ مثال کے طور پر ان کا معجزے سے انکار کرنا۔ ان کا کہنا کہ نماز صرف کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے پڑھنا لازمی نہیں۔ ان کا کہنا عیسائیوں کا کھانا چاہے گوشت حلال طور پر ذبح کیا گیا ہو ہم پر حلال ہے۔ حقیقت میں یہ روش اس زمانے کی مسلم دنیا میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے نتیجے میں کہیں

کہیں نظر آنے لگا۔ بعض اردو مصادر ومراجع میں بھی ہمیں اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر سید ابوالحسن ندوی اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> ''سرسید کا نقطۂ نظر خالص مادی ہو گیا۔ وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے۔ وہ اپنے عقیدے اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔ انہوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان ولغت کے مسلمہ اصول وقواعد اور اجماع وتواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی وعلمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی۔''(۲۱)

دوسرا مسئلہ: سرسید نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے متعلق دوستانہ موقف اختیار نہیں کیا۔ اس میں انگریزوں کے ساتھ ایک مصالحتی رخ اپنایا۔ جنگِ آزادی کو ''غدر'' کا نام دیا۔ اس جنگِ آزادی میں سرسید کی ہمدردیاں انگریزوں سے نمایاں تھیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کو ''دنیا کے بہترین مواقع'' سے تعبیر کیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی انگریزوں سے مسلسل مفاہمت اور وفاداری کے عوض انہیں ۱۸۸۸ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں ڈنبرا یونیورسٹی سے انہیں ایل ایل ڈی (ڈاکٹر آف لاز) کی ڈگری ملی۔ سرسید کی لکھی ہوئی کتاب ''سیرتِ فریدیہ'' کے پیش نظر یہ کہا گیا کہ سرسید کے خاندانی ماحول میں انگریز دوستی اس حد تک رچی بسی تھی کہ انگریزی حکام وقت بے وقت ان کے گھر آجاتے تھے۔ اپنے مسائل کے حل میں ان کی سوجھ بوجھ پر انگریزی حکام کو مکمل بھروسہ تھا۔(۲۲) چنانچہ ان ساری باتوں کی روشنی میں مسلمانوں کے قومی جذبات کا مجروح ہونا اور سرسید سے بدگماں ہونا قدرتی بات تھی۔

۲۔ جن مصادر کے ذریعے مصریوں کو سرسید احمد خان کے بارے میں علم ہوا، ان مصادر میں یا تو سرسید کی دوسری تعلیمی اور اجتماعی خدمات کا سرے سے ذکر نہیں کیا گیا یا پھر سرسری طور پر ذکر کیا گیا، جس سے ان خدمات کی اہمیت اجاگر نہ ہو سکی اور یہی وجہ ہے جسے مصری یونیورسٹیوں اور خصوصاً الازہر یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو نصابات کے ذریعے پورا کر رہے ہیں۔

۴/۶: مصری جامعات میں سرسیّد اور اُردو

اوّلاً: مصر میں اُردو

مصری یونیورسٹیوں میں اُردو زبان وادب کی تدریس کا آغاز بیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہوا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس کے لیے ایک انسٹیٹیوٹ ''معہد الالسنۃ الشرقیۃ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے نصاب میں شاہی فرمان کے ذریعہ اردو زبان کو بھی شامل کیا گیا۔ اس وقت قاہرہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز میں اردو زبان ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں جامعہ ازہر کے فیکلٹی آف اصول الدین کے شعبہ دعوت وارشاد میں اردو کی تدریس شروع ہوئی۔[۲۳] ۱۹۷۰ء میں عین شمس یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز میں اردو سیکشن شروع ہوا۔ سالِ اول میں ڈیپارٹمنٹ کے طلبا وطالبات عربی اور انگریزی کے علاوہ، اردو، فارسی اور ترکی پڑھتے ہیں۔ پھر سالِ دوم میں انہیں اردو، فاسی اور ترکی کے امتحان میں حاصل شدہ نمبروں کے مطابق الگ الگ سیکشن میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن کے نمبر اردو میں زیادہ ہیں وہ اردو سیکشن میں جاتے ہیں اور اس طرح فارسی اور ترکی۔

اسکندریہ یونیورسٹی ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی۔ شروع میں ''معہد اللغات الشرقیہ'' انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل لینگویجز'' میں طلبا مشرقی زبانوں (فارسی، ترکی، عبرانی) میں سے ایک زبان کو تخصص کے ساتھ پڑھتے تھے۔ بیسویں صدی کے ربع آخر (۱۹۸۰ء) میں اس انسٹیٹیوٹ کے نصاب میں اردو زبان بھی شامل کی گئی اس کے علاوہ ۲۰۰۴ء میں اسکندریہ یونیورسٹی ہی کی فیکلٹی آف آرٹس میں ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز کا افتتاح ہوا۔ اس شعبے میں طلب علم بنیادی طور پر فارسی پڑھتا ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ اس کو ترکی اور اردو دونوں میں سے ایک پڑھنا ہوتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے نویں دہائی میں منصورہ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز کے نصاب میں اردو زبان کو ایک اختیار زبان کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ طالب علم بنیادطور پر فارسی پڑھتے ہیں۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ترکی اور اردو زبانوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے پڑھتا ہے۔ پوسٹ گریجویٹ کے مرحلے میں جس طالب علم نے فارسی کے ساتھ اردو پڑھی۔ وہ اردو ہی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کا حق دار ہوتا ہے۔

۲۰۱۵ء میں طنطا یونیورسٹی اور ۲۰۱۶ء میں منوفیہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ آف اورینٹل لینگویجز کے نصابات میں اردو زبان کو بحیثیت معاون زبان کے شامل کیا گیا۔ یوں تو مصر کی چھ بڑی بڑی سرکاری یونیورسٹیوں میں اردو چھ پڑھائی جاتی ہے۔[۲۴]

موجودہ دور میں مصر میں اردو کی ترویج اور خدمت کی فعال سرگرمیوں کے سلسلے میں، تو پھر الازہر یونیورسٹی ہی کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ وجہ یہ ہے کہ الازہر یونیورسٹی میں اُردو زبان وادب کے دو مستقل شعبے ہیں، جہاں اُردو بحیثیت بنیادی زبان کے پڑھائی جاتی ہے، جب کہ باقی یونیورسٹیوں میں اُردو کو ایک ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

ثانیاً: سرسیدؔ تحقیقی مقالوں میں

مصری یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے وہاں ایک عرفِ عام ہے کہ ایم۔اے اور ایم۔فل کے مقالے لکھنے والے سکالرز جس کتاب پر وہ تحقیق کا کام کریں گے (چاہے یہ شعری مجموعہ ہو، یا افسانوں کا مجموعہ، داستان ہو یا ناول ہو، ڈراما ہو یا ناولٹ، برصغیر پاک وہند کی تاریخ سے

متعلق ہو یا اس کی تہذیب وثقافت سے)، اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنا لازمی ہے۔اس بہانے سے مصری جامعات میں اُردو سے عربی میں بہت کتابیں ترجمہ ہوئیں۔درج ذیل کتابوں کے نام ملاحظہ کریں:

۱۔آنندی (غلام عباس)۔اخلاص عبدالفتاح (الازہر یونیورسٹی)
۲۔انارکلی (امتیاز علی تاج) عبیر عبدالکریم (الازہر یونیورسٹی)
۳۔چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر)، دُعاء محمد حسن (الازہر یونیورسٹی)
۴۔ضبط کی دیوار (ڈاکٹر سلیم اختر) نیفین عمر وحسانین مناز ع۔(الازہر یونیورسٹی)
۵۔مکاتیب ضیاء الأمت (پیر محمد کرم شاہ)، رحام عبداللہ سلامۃ۔(الازہر یونیورسٹی)
۶۔رُباعیاتِ محروم (تلوک چند محروم) بدریۃ محمد أحد عبدالقادر۔(الازہر یونیورسٹی)
۷۔سیرت الرسول ﷺ کی نویں جلد (طاہر القادری)، نادیۃ محمود جمعۃ أمین۔(الازہر یونیورسٹی)
۸۔دیوانِ حمد ونعت (ع س مسلم) حبیب محمد حسن بدوی۔(الازہری یونیورسٹی)
۹۔ابن الوقت (نذیر احمد دہلوی)، زینب السیّد عبدالحکیم۔(الازہر یونیورسٹی)
۱۰۔چور بخار، ننگے پاؤں اور متاعِ غرور (اشفاق احمد)، فاطمۃ راغب۔(الازہر یونیورسٹی)
۱۱۔مدینۃ الیھود (محمد سعید)، أسماء الأمیر عبدالحمید، (الازہر یونیورسٹی)
۱۲۔برگِ نے (ناصر کاظمی)، سلویٰ محمود أمین، (الازہر یونیورسٹی)
۱۳۔عام آدمی کے خواب (رشید امجد)، بسمہ محمد أحمد عبدالقادر، (الازہر یونیورسٹی)
۱۴۔سن فلاور، انہونیاں، رنگ پچکاری (ابدال بیلا)، أمیرۃ إبراھیم الدعدع، (الازہر یونیورسٹی)
۱۵۔پاکستان ناگزیر (حسن ریاض)، صباح علی عبدالمعز، (الازہر یونیورسٹی)
۱۶۔پاک بھارت تعلقات (طارق اسماعیل ساگر)، فاطمۃ عبدالتواب عبدالحمید، (الازہر یونیورسٹی)
۱۷۔محبت ایسا دریا ہے (امجد اسلام امجد)، یاسمین جابر محمد، (الازہر یونیورسٹی)
۱۸۔گدھے ہمارے بھائی ہیں (مستنصر تارڑ)، صفیۃ عبدالناصر محمد، (الازہر یونیورسٹی)
۱۹۔تاریخ ارض القرآن (سیّد سلیمان ندوی)، فاطمۃ بدرالدین، (الازہر یونیورسٹی)
۲۰۔امراؤ جان ادا (مرزا محمد ہادی رُسوا) ھناء عبدالفتاح عبدالجواد، (الازہر یونیورسٹی)
۲۱۔باقیات فانی (فانی بدایونی)، سعد عبدالرحیم سیّد، (الازہر یونیورسٹی)
۲۲۔گردشِ رنگِ چمن (قرۃ العین حیدر)، شحات الأزرق منصور فرج، (الازہر یونیورسٹی)
۲۳۔خاک اور خون (نسیم حجازی)، عبدالرحیم عبدالغنی، (الازہر یونیورسٹی)
۲۴۔پاکستان، تاریخ وسیاست (صفدر محمود)، أسامہ شبلی، (الازہر یونیورسٹی)
۲۵۔دو ہاتھ (عصمت چغتائی)، غادۃ مصطفی کامل، (الازہر یونیورسٹی)
۲۶۔تحریک جماعت اسلامی (ڈاکٹر)، ولاء احمد، (الازہر یونیورسٹی)

۲۷۔آوارہ گرد کی ڈائری (ابنِ انشا)، ھیام خلیفہ حامد، (الازہر یونیورسٹی)
۲۸۔صدرِ محترم (اشرف شاد)، اسامہ امین ابو طالب، (الازہر یونیورسٹی)
۲۹۔التوحید کی پہلی جلد (طاہر القادری)، امل ممدوح، (الازہر یونیورسٹی)
۳۰۔سب ٹھیک ہے (اقبال نیازی)، اَسماء شعبان، (الازہر یونیورسٹی)
۳۱۔وجہی سے عبدالحق تک (سیّد عبداللہ)، ایہاب مختار، (الازہر یونیورسٹی)
۳۲۔جامع الأمثال (وارث ہندی)، می جلال، (الازہر یونیورسٹی)
۳۳۔پرندے (جوگندر پال)، دُعاء حمودہ، (الازہر یونیورسٹی)
۳۴۔شگوفے (شفیق الرحمن)، یاسمین محمد عبدالرحمن، (الازہر یونیورسٹی)
۳۵۔تنہا (سلمٰی اعوان)، اَحمد السیّد رضوان، (الازہر یونیورسٹی)
۳۶۔پھول گرتے ہیں (اے حمید)، حجازی ربیع توفیق، (الازہر یونیورسٹی)
۳۷۔صیدِ ہوس، یہودی کی لڑکی (آغا حشر کاشمیری)، یاسر عبدربہ، (الازہر یونیورسٹی)
۳۸۔مہر افروز (عیسوی خان بہادر)، ھدیر مصطفی سیّد مصطفی، (عین شمس یونیورسٹی)
۳۹۔اخلاقِ ہندی (میر بہادر علی حسینی)، منال عبدالعظیم سعید، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۰۔نگاہِ غفلت (طالب بنارسی)، زینب ھانی حلمی، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۱۔اپنے دُکھ مجھے دے دو (راجندر سنگھ بیدی)، رحاب مصطفی محمد، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۲۔ملک العزیز وورجینیا (عبدالحلیم شرر)، رانیا محمد فوزی، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۳۔آنگن (خدیجہ مستور)، منی حمد قھا، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۴۔مجالس النسا (الطاف حسین حالی)، ھبۃ محمد السعید (عین شمس یونیورسٹی)
۴۵۔ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی)، سلویٰ احمد حافظ، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۶۔خوشبو (پروین شاکر)، ولاء سیّد عبدالستار، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۷۔سیرتِ عائشہ (سیّد علیمان ندوی)، وسام حسین السیّد، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۸۔کاروانِ حرم (ع س مسلم)، ایمان شکری طٰہٰ، (عین شمس یونیورسٹی)
۴۹۔سوانح قیس مفتون (حافظ عبداللہ)، محمود عبدالمنصف، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۰۔''لرزمایش'' اور ''حبہ خاتون'' (محمد مجیب)، اِیمان فاروق احمد، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۱۔باپ کا گناہ (حکیم احمد شجاع)، محمد علی عبدالحلیم، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۲۔کہی نہ جائے (ممتاز مفتی)، رباب محمد اَحمد، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۳۔خوابِ گل پریشان ہے (احمد فراز)، بسنت محمد شکری، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۴۔صلاح الدین (قاضی عبدالستار)، امیرۃ احمد ماھر، (عین شمس یونیورسٹی)

۵۵۔ باغ و بہار (میر امن)، دینا احمد جاویش، (عین شمس یونیورسٹی)
۵۶۔ عجائب القصص (شاہ عالم ثانی)، دینا احمد جاویش، (عین شمس یونیورسٹی)

یہ تھے چند کتابوں کے نام جن کا ترجمہ تحقیقی مقالوں میں ہوا۔ دوسرے مقالات جن میں کسی کتاب کا صرف ایک حصہ یا اس سے انتخاب کا ترجمہ ہوا، ان کے علاوہ ہیں۔ ان مقالات میں الازہر یونیورسٹی کا نام نمایاں ہے۔ ان علمی و تحقیقی مقالوں میں سے صرف دو مقالے ایسے ہیں جو سرسیّد پر براہِ راست لکھے گئے۔ ان دونوں مقالوں کا موضوع سرسیّد کے مقالات کا مطالعہ ہے۔

۱۔ **المقالة الأخلاقية و الاصلاحية عندالسير سيّد احمد خان، دراسة تحليلية نقدية:** سرسیّد احمد خان کے اخلاقی اور اِصلاحی مقالات کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ اور عربی میں ترجمہ۔ ولاء جمال (عین شمس یونیورسٹی)

۲۔ المقالۃ الاجتماعیۃ عند السیر سیّد احمد خان، دراسۃ تحلیلیۃ نقدیۃ: سرسیّد احمد خان کے معاشرتی وسماجی مقالات کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ اور عربی میں ترجمہ۔ نورالہدیٰ (عین شمس یونیورسٹی)

ثالثاً: سرسیّد پوسٹ ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں

اس کے علاوہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ ہے۔ وہ بھی سرسیّد کے مقالات سے متعلق ہے، یعنی: صور قمصر فی مقالات السیر سیّد احمد خان: مصر مقالاتِ سرسیّد احمد خان میں۔ ڈاکٹر: یوسف السیّد یوسف (الازہر یونیورسٹی)

رابعاً: سرسیّد شعبہ ہائے اُردو کی نصابات میں

جامعہ الازہر کے بعد جتنی جامعات نے اُردو کو اپنے نصاب میں شامل کیا سب نے الازہر یونی ورسٹی ہی کے شعبہ ہائے اُردو کے نصاب کو سامنے رکھ کر کیا۔ شعبۂ اُردو، الازہر یونی ورسٹی، گرلز برانچ (جو مصر اور عالمِ عرب میں اب تک سب سے جدید مستقل شعبۂ اُردو ہے اور سٹوڈنٹس کی تعداد کے حوالے سے سب سے بڑا ہے) کے نصاب کے مطابق سالِ اوّل کی طالبات پہلے سمسٹر میں ہفتے میں (۱۸ گھنٹے: تین مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اُردو پڑھتی ہیں۔ سال دوم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۴ گھنٹے: پانچ مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۶ گھنٹے: دو مضمون) اُردو پڑھتی ہیں۔ سال سوم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۲ گھنٹے: چار مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اُردو پڑھتی ہیں۔ سال چہارم کی طالبات پہلے سمسٹر میں (۲۰ گھنٹے: چار مضمون) اور دوسرے سمسٹر میں (۱۸ گھنٹے: چار مضمون) اُردو پڑھتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر میں اُردو کی تعلیم و تدریس کس بنیاد پر ہو رہی ہے۔ الازہر کے مقاصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے طالبات ہر سمسٹر میں دینی اور عربی مضمون پڑھتی ہیں جن مضامین میں سرسیّد احمد خان کا براہِ راست مطالعہ کرنے کی گنجائش ہے وہ ہیں:

۱۔ سالِ سوم: اُردو نثر اُنیسویں صدی عیسوی میں۔ (ہفتے میں ۶ گھنٹے)
۲۔ سالِ سوم: برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ] قیامِ پاکستان تک [۔ (ہفتے میں ۶ گھنٹے)
۳۔ سالِ سوم: اُردو اسالیب۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)
۴۔ سالِ سوم: اصولِ تحقیق] اُردو سے متعلق موضوعات [۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)
۵۔ سالِ چہارم: جدید اور معاصر اُردو نثر کا مطالعہ۔ (ہفتے میں ۶ گھنٹے)
۶۔ سالِ چہارم: پاکستان کی جدید اور معاصر تاریخ] اُردو ٹیکسٹ سمیت [۔ (ہفتے میں ۶ گھنٹے)
۷۔ سالِ چہارم: اُردو تنقید۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)
۸۔ سالِ چہارم: اُردو اسالیب۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)
۹۔ سالِ چہارم: اصولِ تحقیق] اُردو سے متعلق موضوعات [۔ (ہفتے میں ۴ گھنٹے)

۶/۵: ایک تجزیہ

مصری یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اُردو کا اصل مضمون چونکہ ادب ہی ہے، سیاست نہیں۔ اس لیے تحقیقی مقالوں میں زبان و ادب پر زور دیا جاتا ہے۔ سیاست اور اس کے نزاعی مسائل سے کم تعرض کیا جاتا ہے۔ سر سیّد کی علمی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر جن مقالوں (چاہے یہ مقالے مکمل ہوئے یا ابھی زیرِ تکمیل ہیں یا پھر مستقبل میں لکھے جائیں گے) کے موضوع کا تعلق ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۴۷ء تک کے عرصے سے ہوتا ہے، ان میں سر سیّد احمد خان اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو لازماً نمایاں کیا جاتا ہے۔ اُردو زبان و ادب پر ان کے احسانات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی کوششوں کو سراہا جاتا ہے۔ علی گڑھ تحریک پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ دو قومی نظریہ اور تحریکِ پاکستان کی بنیاد سر سیّد اور ان کی تحریک سے جوڑی جاتی ہے اور یہی معاملہ درج بالا مقالات کا بھی ہے۔ تحقیقی مقالے مکمل ہونے کے بعد کتابی شکل میں چھپ جاتے ہیں اور یوں پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کی نظر سے گزرتے ہیں اور انھیں پڑھنے کی نوبت بھی آتی ہے، دوسرے لفظوں میں ان لوگوں کو سر سیّد احمد خان کی علمی و ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے ذہن میں موجود سر سیّد کے بارے میں جو روایتی تصوّر ہے، وہ آہستہ آہستہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں ہمیں اعتراف یہ کرنا پڑے گا کہ یہ معاملہ وقت طلب ہے۔ ہمیں توقع نہیں ہونی چاہیے کہ جس پیمانے پر اور مختصر وقت یں مصر سمیت عالمِ عرب میں علامہ محمد اقبال کا تعارف ہوا، اسی پیمانے پر اوراتنے وقت میں سر سیّد احدم خان کا ہوگا اور حقیقت میں علامہ محمد اقبال اس مقام کا حق دار ہیں، حالانکہ دونوں کثیر الجہات بڑی شخصیت ہیں۔ اس کی میری رائے میں چند وجوہات ہیں:

۱۔ علامہ محمد اقبال اعلیٰ تعلیم یافتہ مفکر، فلسفی اور اس سے بڑھ کر شاعر تھے۔ ان کا فلسفہ اور کلام آفاقیت کا حامل تھا۔ انہی فلسفے اور شاعری کی بہ دولت ان کو عالمگیر شہرت ملی۔ یہ چیز سرسیّد کے ہاں نہیں۔

۲۔ علامہ اقبال ایک عالمگیر شخصیت تھے۔ ان کی فکر، ان کے فلسفے اور ان کے کلام کا محور پورا عالمِ اسلام تھا۔ بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کا نصب العین کا دائرہ صرف عالمِ اسلام نہیں، بلکہ پوری انسانیت پر محیط تھا۔ جب کہ سرسیّد ان کی بہ نسبت ایک مقامی شخصیت تھے۔ ان کا نصب العین مسلمانانِ ہند تھا۔ بے شک یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا اور اس کے لیے بھی بہت محنت ہوئی ہوگی۔

۳۔ جن حالات میں سرسیّد رہے، جن رکاوٹوں کا انھوں نے سامنا کیا، اور جن نزاعی مذہبی مسائل میں وہ پڑ گئے، ان کا سرسیّد پر منفی اثر رہا۔ یہ معاملہ علامہ اقبال کے ہاں نہیں۔

۴۔ مصر سمیت عالمِ عرب میں علامہ اقبال کا تعارف اور تصور شروع ہی سے اچھا تھا۔ ان کے کلام کا عربی میں کئی دفعہ ترجمہ ہوا۔ ان کو اہمیت دی گئی، چنانچہ یہ تصور وقت کے ساتھ ساتھ مزید اچھا ہو گیا۔ ان کے برعکس سرسیّد کی شخصیت خود ہندوستان میں متنازع تھی۔ چہ جائیکہ عالمِ اسلام میں، جہاں ان کا پہلا تعارف ایک انگریزوں کے حامی اور اسلام اور مسلمانوں کے مخالف شخص کی حیثیت سے ہوا۔ چنانچہ مصر سمیت عالمِ عرب میں سرسیّد کے ان افکار وخیالات پر بحث ومباحثہ کیا گیا جو مذہب کے متعلق متنازع تھے۔ ان کے ادبی وتعلیمی کارناموں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی جب کہ علامہ اقبال کا معاملہ ان کے برعکس تھا۔ ان کی ہر بات کو اہمیت دی گئی۔ ان سارے افکار وخیالات پر روشنی ڈالی گئی۔

ان وجوہات کے پیشِ نظر اور سرسیّد کی شخصیت کے روشن پہلوؤں اور ان کی تعلیمی ومعاشرتی خدمات کے بارے میں عربی میں لکھی ہوئی کتابوں کے فقدان کی وجہ سے، یہ قدرتی اَمر بن جاتا ہے کہ عالمِ عرب میں سرسیّد احمد خان کی اہمیت اتنی نہیں جتنی علامہ محمد اقبال کی ہے۔

۶/۶: نتائج

مصری یونیورسٹیوں میں سرسیّد احمد خان کے مطالعے کے اس تجزیے کی روشنی میں ہم درج ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

۱۔ سرسیّد احمد خان ایک مختلف الحیثیات اور کثیر الجہات شخص تھے، انھوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی، غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا انھوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ دیرپا اثرات باقی چھوڑے۔ [۲۵]

۲۔ مذہبی مسائل پر مقالے اور کتابیں لکھنا سرسیّد احمد خان کے اصل مقاصد میں شامل نہیں تھا۔ نہ ہی یہ ان کا اصل میدان تھا۔ بات یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے مخصوص مذہبی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی حالات کے پیشِ نظر سرسیّد کے نزدیک مذہبی بحثوں میں اُلجھے بغیر مضمون نگاری کرنا ناممکن ہے۔ اس

وجہ سے ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسیّد کے مضامین میں مذہبی رنگ پایا جاتا ہے، حالانکہ خود سرسیّد نے ''تہذیب الاخلاق'' ہی میں کئی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ ''مذہبی بحث اس پرچے کا مدعا نہیں۔مگر چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں نے مثل ہندوؤں کے مذہب، تمدن اور معاشرت متحد سمجھ رکھا ہے۔۔۔اس لیے مجبوراً مذہبی بحث کرنی پڑ جاتی ہے، ورنہ اس پرچے میں ہم کو عقائد و مسائل مذہبی سے بحث کرنا مقصود اصلی نہیں۔''(۲۶) ہماری نظر میں شاید یہی وجہ ہے کہ سرسیّد نے مذہبی مسائل پر مقالے اور کتابیں لکھیں۔

۳۔ سرسیّد کے مذہبی خیالات و رُجحانات نے ہندوستان بھر میں آگ لگا دی، چنانچہ اس تحریک کے خلاف ردِعمل بھی کوئی کم شدید نہ ہوا۔ اِنفرادی احتجاج اور کٹر مُلّاؤں کی تکفیر سے قطع نظر ''اودھ پنچ''(۲۷) کی صورت میں اچھا خاصہ متحدہ محاذ قائم ہوا، جس میں سرسیّد پر شدید تنقید ہوتی رہی۔ انھیں ''پیرِ نیچر'' کے خطاب سے نوازا گیا اور علی گڑھ کالج کو لامذہبیت کا مرکز قرار دیا گیا اور یوں سرسیّد کی تحریک ''نیچریہ مذہب'' قرار پائی۔(۲۸)

۴۔ مذہبی افکار و خیالات کے حوالے سے ہندوستان میں سرسیّد کے بارے میں یہی تصور مصر میں مجلہ ''العروۃ الوثقیٰ'' اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کی عربی تصانیف کے ذریعے پہنچا، پھر ان دونوں کو بنیاد بنا کر مزید کتابیں لکھی گئیں، جس کی وجہ سے مصری مذہبی حلقوں میں یہ تصور ایک حد تک راسخ ہو گیا۔

۵۔ اس کے باوجود مصر میں ایسی تصانیف بھی ملیں گی جن میں سرسیّد کے انہی مذہبی رُجحانات کو سراہا گیا۔

۶۔ مصری یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اُردو زبان و ادب سرسیّد احمد خان کی علمی و ادبی تحریک کے مطالعے کو اپنے نصابات میں داخل کر کے انھیں وہ علمی و ادبی مقام دلانے میں سعیِ مشکور کر رہے ہیں جس کا سرسیّد مستحق ہیں۔

۷۔ مصر کے پڑھے لکھے اور مذہبی حلقے کے لوگوں کے ذہن میں موجود سرسیّد کے بارے میں جو روایتی تصور ہے، اس کو بہتر بنانے کے لیے وقت درکار رہے۔ یہ تبدیلی بوجوہ آہستہ آہستہ ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمیں توقع نہیں ہونی چاہیے کہ جس پیمانے پر اور مختصر وقت میں مصر سمیت عالمِ عرب میں علامہ محمد اقبال کا تعارف ہوا، اسی پیمانے پر اور اتنے وقت میں سرسیّد احمد خان کا ہوگا۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ مجیب الرحمن، سیّد جمال الدین افغانی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے تصورِ انقلاب کا تقابلی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شعبہ علومِ اسلامیہ، ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء، ص:۳۲
۲۔ آل اظہر آنس، سیّد، سرسیّد کے معترضین، تنقیدی و تحقیقی جائزہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، پشاور: شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۶
۳۔ ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۷۴ء، ص: ۹۴۔۹۵
۴۔ رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا، اور ۱۸۷۷ء تک نکلتا رہا۔ اس سات سالہ دور میں سرسیّد نے ۱۱۲ مضامین لکھے۔ سن ۱۸۷۹ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کے دورِ جدید کا آغاز کیا۔ اب کے یہ رسالہ ۲۹ مہینے (جولائی ۱۸۸۷ء تک) جاری رہا۔ اس عرصے میں سرسیّد نے اس میں ۲۳ مضامین لکھے۔ تہذیب الاخلاق کے دورسوم کا آغاز ۱۸۹۴ء میں ہوا، اور اب کے یہ ۱۸۹۷ء تک نکلتا رہا۔ اس تین سالہ دور میں سرسیّد نے ۳۷ مضامین لکھے۔ سرسیّد کی تصنیفات و تالیفات کی تدوین میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی کتاب: سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رُفقا سے مدد لی گئی۔
۵۔ میرٹھ میں سرسیّد احمد خان کی تقریر، مؤرخہ ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء
۶۔ نسیم قریشی، اُردو ادب کی تاریخ علی گڑھ: ۱۹۷۸ء، ص: ۱۶۴۔۱۶۵
۷۔ مقالاتِ سرسیّد، حصہ ہشتم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۱۶۴
۸۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔۱۶۵
۹۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔۱۶۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۶
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔۱۶۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ ایم۔ اے کرندیکر، اسلام اور ہندوستان کا جدیدیت کی جانب سفر، کراچی: ایسٹرن پبلشر، ملیر، ص ۱۴۸۹، بحوالہ سرسیّد اور حالی کا نظریۂ فطرت
۱۶۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، بیروت، لبنان: دارالکتاب العربی، ت۔ د، ص ۱۲۵
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۷
۱۹۔ ظفر حسن، سرسیّد اور حالی کا نظریہ فطرت، پی ایچ ڈی کا مقالہ، شام شورو: شعبۂ اُردو جامعہ سندھ، ۱۹۷۵ء، ص ۴۷۔
۲۰۔ محمد البھی، ڈاکٹر، الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی، ص ۲۹
۲۱۔ سلیمان ندوی، سیّد، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۷۴ء، ص ۹۷۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کے کسی میدان میں جو سرخیل رہنما ہوتے ہیں ان سے اگر اسی قسم کی بھول ہو جاتی ہے تو وہ اس وجہ سے قابلِ معافی ہوتے ہیں کہ ان سے پہلے کسی نے اس میدان میں اتنی شجاعت اور بہادری کے ساتھ قدم نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ ہند کے حوالے سے سرسیّد احمد خان کے اخلاص پر کوئی شک نہیں۔
۲۲۔ ظفر حسن، سرسیّد اور حالی کا نظریۂ فطرت، ص ۱۴۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سطحی تجزیہ ہے، کیونکہ ہم اس زمانے کے حالات کا گہرا مطالعہ کیے بغیر ایسا نتیجہ نہیں نکال سکتے۔
۲۳۔ فوقیہ افضل، مصر میں اُردو کی ترویج، ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم کی خدمات کا جائزہ، مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور ۲۰۰۷ء۔ ۲۰۰۹ء، ص ۵۳
۲۴۔ فی الحال اُردو کسی بھی پرائیویٹ یونیورسٹی میں نہیں پڑھائی جاتی۔
۲۵۔ عبداللہ، سیّد، سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رُفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری تجزیہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۳
۲۶۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، سرسیّد اور ان کے نامور رُفقاء، ص ۱۶
۲۷۔ اودھ پنچ، ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء، منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے نکالا۔ ہر جمعرات کو نکلتا۔ ۱۲ صفحات ہوتے تھے یہ اپنے وقت کا مقبول ترین مزاحیہ اخبار تھا۔ ۱۹۱۳ء میں یہ اخبار بند ہوا۔
۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۳۳۴